

شیخ محمد عبده کی تجدیدی فکر

پر موقوف نہیں رہے گا، بلکہ عصبيت کا خاتمہ ہوگا اور یہ ایک ایسا نقطہ اور مرکز بن جائے گا جو ایک بڑی وطنی جماعت کو ایک لڑی میں پرودے گا۔ امام موصوفؒ نے خاندانی اصلاح پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ دراصل اس کے پس پردہ بہت سے اسباب ہیں، جن میں سے بعض کا تعلق نظریہ اور فکر سے ہے اور بعض کا تعلق رفاہ عامہ پر مبنی معاشرے کے قیام کے ساتھ ہے، جس میں خاندانی وحدت اور تعلقات بڑا کردار ادا کرتے ہیں۔

فنون لطیفہ

شیخ محمد عبده نے ادب کے میدان میں ایک نیا اصلاحی باب قائم کیا۔ وہ باب فنون لطیفہ کا ہے۔ فنون لطیفہ کے ذریعے اہل ادب قوم کے سرمایہ کو دوسرے زمانے تک منتقل کرتے ہیں۔ اسی کے ذریعے قوم کی تہذیب و ثقافت اور اخلاقیات کو دوام حاصل ہوتا ہے اور وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ لیکن تنگ نظر لوگوں نے ہمیشہ فنون لطیفہ کو گناہ تصور کیا ہے۔ وہ اس کو شیطانی عمل قرار دیتے ہیں۔ شیخ موصوفؒ نے تصاویر کو علم و حقائق کی حفاظت کا وسیلہ اور انسانی ذوق اور لطافت کی ترقی کا باعث قرار دیا ہے، جس طرح اشعار انسان میں ادبی ذوق پیدا کرتے اور اس کو کمال تک پہنچاتے ہیں، حالاں کہ ان کی تخلیق کی اسلام میں کوئی پابندی اور ملامت نہیں ہے۔ ۱۳۔

خلاصہ بحث

شیخ محمد عبده نے جس تجدید کا ارادہ کیا اور جس احیاء کے لیے کوششیں کیں وہ صرف اس پر موقوف نہیں کہ دین کو بدعات، خرافات اور بے بنیاد اضافوں سے پاک کر دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ وہ ایک کامل اور ہر طرف سے مکمل تجدید ہو جو عقل جدید کے ذریعے اسلامی میراث کا شعور الہام کرے اور اس کے ساتھ عصر حاضر کے علوم اور دوسری تہذیبوں کے ثمرات کو یکجا کرے، تاکہ تجدید دین اور اس کے حامی علم دوست اور معاشرے سے محبت کرنے والے بن جائیں۔ مذکورہ بالا خیالات واقفکار کی بنا پر کہا جاسکتا ہے کہ شیخ موصوفؒ جدید اسلامی تاریخ کی اہم اور نمایاں شخصیات میں سے ہیں۔ وہ

نظر و فکر کے میدان میں ایک ایسا روشن ستارہ تھے جس پر اندھی تقلید، جہالت اور تعصب کے بادل اپنا سایہ نہ کر سکے۔ وہ یونانی فلسفہ کے مذاہب اور اسلامی فکر کی فلسفیانہ میراث کے بارے میں کافی بصیرت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ جدید غیر ملکی نظر و فکر کے طریق سے بھی باخبر تھے۔ مزید یہ کہ انہوں نے مختلف علوم، مثلاً ادب، تاریخ، تہذیب اور معاشرت کا بغور مطالعہ کیا، جس کی وجہ سے ان کی دینی اور فلسفیانہ آراء میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ وہ اپنے فلسفیانہ اسلوب سے ادب و دین اور عقلی علوم میں ایک تعلق پیدا کرنا چاہتے تھے، تاکہ مصری معاشرہ دین و دنیا کی ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے اعلیٰ مقام تک پہنچ جائے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ امام موصوف کے دینی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور سماجی افکار مغربی افکار و شخصیات سے مستفاد نہیں، بلکہ قرآن و حدیث میں ان کے تدبر و تفکر کا نتیجہ ہیں۔

حواشی و مراجع

- ۱۔ سید رشید رضا، مجلہ 'المنار'، مطبع المنار، مصر، ۱۹۲۸ء، جلد ۸، ص ۸۸۱
- ۲۔ صحیح بخاری، جلد ۲، ص ۱۵ ۳۔ ایضاً، جلد ۳، ص ۱۸
- ۴۔ مسند احمد، جلد ۲۹، ص ۳۲۶ ۵۔ مجلہ المنار، جلد ۵، ص ۴۴۱
- ۶۔ صحیح مسلم، کتاب اللقطہ، باب استحباب المواساة بفضول المال
- ۷۔ بہ حوالہ علی عبدالرازق، 'الاسلام و اصول الحکم'، المؤسسة العربیة للدراسات والنشر، بیروت، ۱۹۲۰ء، ص ۱۵۸، ۱۶۳۔
- ۸۔ الأعمال کاملہ للامام محمد عبدہ، جلد ۳، ص ۲۳۳
- ۹۔ مجلہ المنار، جلد ۲، ص ۳۵۴
- ۱۰۔ محمد نذیر کا کاخیل، محمد عبدہ کی تعلیمی اصلاحات، فکر و نظر، اگست ۱۹۹۲ء، جلد ۷، ص ۸۹
- ۱۱۔ مجلہ المنار، جلد ۲۶، ص ۷۵۶ ۱۲۔ تفسیر المنار، جلد ۱، ص ۳۰۴
- ۱۳۔ ڈاکٹر محمد عمارہ، امام محمد عبدہ مجدد الدین، بتجدید الدین، دار الشروق قاہرہ، ۱۹۸۸ء، ص ۲۲۷، ۲۲۸

تحقیق و تنقید

حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان

مطالعہ و تجزیہ

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

علامہ شبلی نعمانیؒ کی ایک تصنیف امام ابوحنیفہؒ کی سوانح اور فقہی خدمات پر 'سیرۃ النعمان' کے نام سے ہے۔ اس پر تنقید و تجزیہ کے طور پر متعدد اصحاب علم کی تصنیفات منظر عام پر آئی تھیں۔ ان کے جائزہ پر مشتمل ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی کا مقالہ 'معارضات سیرۃ النعمان' کے عنوان سے تحقیقات اسلامی (اپریل - جون ۲۰۰۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس موضوع پر ایک اہم تصنیف مولانا عبدالعزیز محمدی رحیم آبادی (م ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) کی 'حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان' ہے، جس میں مصنف نے علامہ شبلی کی جانب سے امام ابوحنیفہؒ کی مدح و منقبت میں مبالغہ آرائی اور حدیث سے متعلق بعض مباحث کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ اس مقالہ میں مذکورہ کتاب کا تفصیلی مطالعہ کیا گیا ہے۔ (رضی الاسلام)

'سیرۃ النعمان' علامہ شبلی نعمانیؒ کی ابتدائی دور کی تصنیف ہے، اگرچہ اس کی اشاعت المامون کے بعد ہوئی تھی۔ علامہ اس وقت کٹر حنفی تھے اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹھی کے تلمذ کی وجہ سے مزاج میں کچھ مناظرانہ تیزی بھی تھی۔ علی گڑھ کے قیام اور ڈاکٹر آرنلڈ کی مصاحبت کی وجہ سے ان کا مزاج بعد میں تحقیقی ہو گیا تھا، اس لیے ان کی تصنیفات میں تحقیق کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ سیرۃ النعمان کے رد میں اہل حدیث علماء کی جانب سے جو کتابیں لکھی گئیں ان میں تین کتابیں اہم ہیں:

(۱) مولانا عبدالعزیز محمدی رحیم آبادی (م ۱۳۳۸ھ / ۱۹۲۰ء) کی 'حسن

البیان فی مافی سیرۃ النعمان'

(۲) مولانا حکیم حافظ ابو یحییٰ محمد شاہ جہاں پوری (م ۱۳۳۳ھ / ۱۹۲۰ء) کی الارشاد الی سبیل الرشاد بہ جواب سبیل الرشاد از مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔

(۳) مولانا عبد السلام مبارک پوری (۱۲۸۹ - ۱۳۴۲ھ) کی سیرۃ البخاریؒ۔ مؤخر الذکر دونوں کتابوں میں سیرۃ النعمان کے تعلق سے جو بیانات ہیں وہ حسن البیان ہی کی بازگشت ہیں، نیز دونوں مصنفین نے تفصیل کے لیے اسی کتاب کے مطالعہ کی سفارش کی ہے، اس لیے اس مقالے میں 'حسن البیان' ہی کا مطالعہ کیا جائے گا۔ مزید یہ کہ اس وقت ناچیز کے سامنے سیرۃ النعمان کا دارالمصنفین کا شائع کردہ ۲۰۰۵ء کا ایڈیشن ہے اے، جس میں مصنف نے صاحب سیرۃ البخاری کے بیان کے مطابق حسن البیان کے اعتراضات کی روشنی میں اپنی بعض غلطیوں کی اصلاح کر لی تھی، اس لیے وہ غیر اصلاح شدہ ایڈیشنوں پر اعتراضات سے صرف نظر کرے گا۔ اپنے سابق مقالہ 'معارضات سیرۃ النعمان' میں ناچیز نے گفتگو کو صرف مباحث حدیثیہ تک محدود رکھا تھا اور صرف تین نکات پر بحث کی تھی: اخبار آحاد کی حجیت، درایت اور فقہ راوی۔ لیکن چون کہ اجتہاد کی بنیاد نص پر ہوتی ہے، اس لیے مباحث فقہیہ میں بھی حدیث کے موضوع پر گفتگو ناگزیر ہے۔ بنا بریں اس مقالے میں 'حسن البیان' کی تعقیبات کی روشنی میں سیرۃ النعمان کے تمام مباحث حدیثیہ و فقہیہ کا جائزہ لیا جائے گا۔

مناسب ہوگا کہ پہلے موضوع کی مناسبت سے سیرۃ النعمان کے مباحث کی تلخیص پیش کر دی جائے:

(۱) علامہ شبلیؒ نے امام ابو حنیفہؒ کے شیوخ الحدیث کی تعداد یوں بتائی ہے:

کوفہ سے: امام شعبیؒ، سلمہ بن کہیلؒ، ابواسحاق سمعیؒ، سماک بن حربؒ، محارب بن دثارؒ، عیون بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعودؒ، ہشام بن عروہؒ، سلیمان بن مہرانؒ، معروف بہ اعمشؒ۔

بصرہ سے: قتادہ شعبیہؒ۔ شام سے: اوزاعیؒ۔ مکہ سے: عطاء بن ابی رباحؒ، عکرمہؒ۔

مدینہ سے: فقہائے سبعہ، سلیمان بن عبداللہؒ، سالم بن عبداللہؒ، امام باقرؒ فرزند امام جعفر

صادق (ص ۳۲ تا ۴۲)

رجال کی کتابوں سے امام صاحب کے جن اساتذہ کے نام اخذ کیے جاسکتے ہیں ان کی تعداد سینکڑوں تک پہنچتی ہے۔ (ص ۴۵ تا ۴۸)

(۲) علامہ شبلی نعمانی نے امام صاحب کی ذکاوت، ذہانت اور طباعی میں ان کے فتاویٰ اور مناظروں کو پیش فرمایا ہے۔ ان میں سے چند پر تعقیبات کا ذکر کیا جائے گا۔

(۳) امام صاحب کی تصنیفات کے ذیل میں علامہ شبلی نے دو کتابوں 'فقہ اکبر' اور 'مسند خوارزمی' کے نام لیے ہیں، لیکن موصوف نے ایک طویل گفتگو کے بعد اپنی رائے دی ہے کہ ان دونوں کتابوں کو امام صاحب کی تصنیف ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ (ص ۱۰۵ تا ۱۰۸)

عقائد اور کلام کے باب میں علامہ نے ان مسائل کا تذکرہ خصوصیت سے کیا ہے کہ اعمال جزو ایمان نہیں ہیں اور ایمان اور عمل دونوں جدا گانہ چیزیں ہیں۔ اس ذیل میں انھوں نے عثمان البتی کے نام ایک دوستانہ خط کے کئی اقتباسات نقل کئے ہیں۔ (ص ۱۱۴ تا ۱۱۵) امام صاحب اہل قبلہ کی تکفیر نہیں کرتے تھے۔

(۴) حدیث اور اصول حدیث: اس سلسلے میں درج ذیل چند نکات کی اہمیت ہے:

۱۔ مجتہد اور محدث کی حیثیتیں الگ الگ ہیں۔

۲۔ اجتہاد کی شرط اور امام صاحب کا مجتہد مطلق ہونا۔

۳۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی مرویات کی تعداد سترہ (۱۷) اور پچاس

(۵۰) سے زیادہ نہیں ہیں۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کا بھی یہی حال ہے۔

۴۔ بخاریؒ و مسلمؒ نے امام شافعیؒ کے واسطے سے کوئی حدیث روایت نہیں کی۔

۵۔ ایمان کی حقیقت میں عمل کو داخل نہ سمجھنے والوں سے امام بخاریؒ نے روایت نہیں کی۔

۶۔ اہل الرائے کی تحقیق امام صاحب کے اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کی وجہ۔

۷۔ امام صاحب کا محدث اور حافظ الحدیث ہونا۔

۸۔ امام صاحب کا خیال تھا کہ بہت کم حدیثیں صحیح ہیں۔ ان کے نزدیک:

”صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کانوں سے سنا ہو اور روایت کے وقت

یاد رکھا ہو۔“ (ص ۱۴۳)

۹۔ اخبیرونا وحدثنا کے مفہوم کی وسعت۔

۱۰۔ روایت بالمعنی کی بحث۔

۱۱۔ اصول درایت۔ (ص ۱۵۱)

۱۲۔ امام صاحب نے صراحت کی ہے کہ وہ احادیث کے مقابلہ میں قیاس کا اعتبار نہیں کرتے۔ (ص ۱۵۸)

۱۳۔ مراتب احادیث کا تفاوت۔ (ص ۱۶۳)

۱۴۔ خبر واحد قطع نہیں۔ (ص ۱۷۲)

(۵) فقہ:

۱۔ مجتہد صحابہ و تابعین: عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ، علقمہؓ، ابراہیم نخعیؓ۔

۲۔ تدوین فقہ: ان تلامذہ کی تفصیل جو تدوین فقہ میں شریک تھے۔

”امام طحاوی نے بہ سند متصل اسد بن فرات سے روایت کی ہے کہ ابوحنیفہؒ کے تلامذہ، جنہوں نے فقہ کی تدوین کی، چالیس تھے، جن میں یہ لوگ زیادہ ممتاز تھے: ابو یوسفؒ، زفرؒ، داؤد الطائمیؒ، اسد بن عمرؒ، یوسف بن خالد تیمیؒ، یحییٰ بن ابی زائدہؒ۔“

۳۔ تدوین کا طریقہ: امام صاحب کی درس گاہ ایک قانونی مدرسہ تھا۔ (ص ۱۸۴)

۴۔ امام صاحب کے زمانہ میں جو مجموعہ فقہ مرتب ہوا تھا وہ معدوم ہو گیا تھا:

”امام صاحب کے مسائل کا آج جو ذخیرہ دنیا میں موجود ہے وہ

امام محمدؒ اور قاضی ابو یوسفؒ کی تالیفات ہیں۔“ (ص ۱۸۲)

۵۔ سلاطین اکثر حنفی تھے۔

۶۔ حنفی مذہب کے حسن قبولیت کا سبب۔ ابن حزم کے اعتراضات کا جواب۔

۷۔ دور مجتہدین کے رواج مذہب کے اسباب۔

۸۔ تشریحی اور غیر تشریحی احادیث کا فرق۔

”حنفی فقہ کو بمقابلہ اور فقہوں کے بڑی خصوصیت جو حاصل ہے وہ یہی ہے کہ

۔۔۔ اس میں وہ وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے جو (دیگر) ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔ (ص ۱۹۴)

۹۔ جو مسائل تشریحی نہیں ہیں ان میں حضرت عمرؓ کا رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ میں تین طلاوتوں کو ایک سمجھے جانے کو تین شمار کرنا شامل ہے (یعنی یہ مسئلہ تشریحی نہیں تھا)۔

۱۰۔ اصول فقہ کی کلیات:

”فقہ کے اس حصہ میں امام صاحب کی حیثیت ایک مفسر اور مستنبط کی ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس باب میں امام صاحب نے جو کام کیا وہ نہ صرف تاریخ اسلام، بلکہ کل دنیا کی تاریخ میں بے نظیر ہے۔ (ص ۱۹۹)

۱۱۔ فقہ کا دوسرا حصہ:

”امام ابو حنیفہؒ اس صفت میں اپنے تمام ہم عصروں سے ممتاز تھے کہ وہ مذہبی تقدس کے ساتھ دنیاوی اغراض کے اندازہ شناس تھے اور تمدن کی ضرورتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ (ص ۲۰۱)

۱۲۔ کیا فقہ حنفی رومن لا سے ماخوذ ہے؟

”لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس موقع پر میں جو کچھ لکھوں گا اس کا رتبہ قیاس اور ظن سے زیادہ نہیں، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جن لوگوں نے اس بحث کو چھیڑا ہے وہ بھی قیاس و ظن سے کام لیتے ہیں، کیوں کہ باوجود تحقیق کے ہم کو کوئی ایسا منصف نہیں ملا جس کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ رومن لا اور حنفی فقہ کے تمام یا اکثر مسائل کا مقابلہ کر چکا ہے۔ (ص ۲۰۴)

۱۳۔ فقہ حنفی کا اصول عقلی کے مطابق ہونا۔ (ص ۲۰۸)

”اس دعویٰ سے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب عقل کے موافق ہے، شافعیہ وغیرہ کو بھی انکار نہیں اور وہ انکار کیوں کرتے۔ ان کے نزدیک احکام شرعیہ خصوصاً عبادات جس قدر عقل سے بعید ہوں، اسی قدر ان کی خوبی ہے۔ (ص ۲۱۱)

”اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ امام ابو حنیفہؒ یا کسی مجتہد نے صرف عقل و قیاس

سے نماز کے ارکان متعین کیے ہیں۔ ائمہ نے ان ارکان کے ثبوت کے لیے عموماً احادیث کی تشریحات یا اشارات سے استدلال کیا ہے۔ (ص ۲۱۵)

۱۴۔ فقہ حنفی کا آسان اور سہل ہونا۔ (ص ۲۱۷)۔

۱۵۔ فقہ حنفی میں معاملات کے متعلق جو قاعدے ہیں وہ نہایت وسیع تمدن کے موافق ہیں۔ (ص ۲۱۹)

۱۶۔ نکاح کے مسائل و محرمات نکاح۔

(الف) ”ان میں حرمت بالزنا کا مسئلہ ہے جو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے اختلاف کا ایک معرکہ آرا مسئلہ ہے۔“

(ب) خیار نکاح: ”امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عورت منصب قضاء پر مامور کی جاسکتی ہے، لیکن اور ائمہ مخالف ہیں، کیوں کہ عورت خود سے نکاح کا اختیار نہیں رکھتی۔“ (ص ۲۲۴)

(ج) اختلافی مسائل کا جدول [۷] طلاق رجعی میں وطی حرام نہیں ہے۔

۱۷۔ ذمیوں کے حقوق:

”امام ابو حنیفہؒ نے ذمیوں کو جو حقوق دیے ہیں، دنیا میں کسی گورنمنٹ نے کبھی کسی قوم کو نہیں دیے۔“ (ص ۲۲۹)

”ذمیوں کی اعزاز کی حالت یہ ہے کہ وہ حرم محترم میں جاسکتے ہیں، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں آباد ہو سکتے ہیں، تمام مسجدوں میں بغیر اجازت کے داخل ہو سکتے ہیں۔“ (ص ۲۳۱)

”رسوم و عادات کی نسبت حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اہل ذمہ اس کی پابندی کریں۔ یہی احکام امام ابو حنیفہؒ اور قاضی ابو یوسفؒ نے قائم رکھے، جن کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ دونوں قومیں اپنی خصوصیات پر قائم رہیں۔“ (ص ۲۳۵)

۱۸۔ فقہ حنفی کا نصوص شرعی کے موافق ہونا۔ اس بدگمانی کی تردید کہ فقہ حنفی کے مسائل حدیث کے مخالف ہیں۔ ۲۔

۱۹۔ عورت کے چھونے سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ (ص ۲۴۲)

۲۰۔ مقتدی کے لیے قراءت فاتحہ ضروری نہیں ہے رمزد دیگر مسائل حلال و حرام۔

’سیرۃ النعمان‘ کے دوسرے حصہ میں علامہ شبلیؒ نے سب سے پہلے ایک کلامی بحث اعمال کے داخل ایمان ہونے کی بحث“ کو چھیڑا ہے۔ امام صاحب کا زمانہ علم کلام کی ابتدا کا تھا، نیز اصول فقہ بھی تقریباً منطقی اور کلامی ہی ہوتا ہے۔ اس لیے اگر اس زمانے میں مذکورہ بحث چھیڑی گئی تو شاید یہ وقت کا تقاضا تھا، لیکن علامہ شبلی نے اس بحث کو جو اتنا طول دیا ہے اس کا سبب ان کا کلامی ذہن تھا۔

صاحب ’حسن البیان‘ ۳۔ نے سب سے پہلے اسی بحث سے اپنی کتاب کا آغاز کیا ہے اور امام صاحب نے ایک خط میں، جو عثمان الہندی کے نام لکھا گیا تھا، دلائل کے طور پر جو آیتیں نقل فرمائی ہیں، ان کے مدلول پر اعتراض کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ امام صاحب نے اپنے مسلک کی تصویب میں جتنے بھی عقلی و نقلی دلائل دیے ہیں، صاحب ’حسن البیان‘ نے ویسے ہی عقلی و نقلی دلائل سے ان کا رد کیا ہے۔

’اعمال کے داخل ایمان ہونے کی بحث‘ کا لازمی نتیجہ ایمان میں کمی بیشی کی بحث ہے۔ نعمانی صاحب نے اسی لیے اس کا عنوان معصلاً قائم کیا ہے۔ صاحب ’حسن البیان‘ نے اس سلسلے میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے:

”علامہ شبلیؒ نے زیادتی و نقص ایمان کی بحث میں لکھا ہے کہ امام صاحب کے قول کا مطلب نہ صرف محدثین اور شافعیہ نے، بلکہ خود احناف نے نہیں سمجھا“

مقالہ نگار کا خیال ہے کہ علامہ شبلیؒ نے اس بحث کو بلا سبب اتنا طول دے کر مخالفین کو دعوت مبارزت دی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایمان کو عمل سے خارج کر دیا جائے تو ایمان میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک قانونی نکتہ ہے، جس پر تعزیرات کا دار و مدار ہے۔ لیکن آیات و احادیث شاہد ہیں کہ صفات کے لحاظ سے ایمان میں کمی بیشی ہوتی ہے۔ اس لیے ایمان کو عمل میں داخل سمجھنا لازمی ہے۔

صاحب ’حسن البیان‘ کا خیال ہے کہ صاحب ’سیرۃ النعمان‘ نے امام ذہبیؒ کے حوالے سے جو بات لکھی ہے اس سے اولاً امام بخاریؒ کی تنقیص لازم آتی ہے، ثانیاً وہ بات بھی

غلط ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے امام ذہبیؒ کی جانب سے امام بخاریؒ کی مخالفت کا سبب قراءت قرآن کی مخلوقیت (یا غیر مخلوقیت) کو بتایا ہے، نہ کہ ایمان کی زیادتی و کمی کو۔ (ص ۲۰)

علامہ شبلیؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کا دفاع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”امام مالکؒ اور امام شافعیؒ بھی اس لقب (محدث) سے مشہور نہ تھے، نہ ان کی تصانیف کو وہ مقام حاصل ہوا جو صحاح ستہ کو حاصل ہے۔“ امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کے اجتہاد پر اتفاق عام نہ ہوا۔ صاحب ”سیرۃ النعمان“ کا مقصد اس تحریر سے یہ ثابت کرنا ہے کہ امام صاحبؒ اہل الرائے کے لقب سے مشہور ہونے کے باوجود محدث تھے۔ صاحب ”حسن البیان“ نے خلاصہ تذہیب البہذیب کے حوالے سے اس دعوے کا رد کیا ہے۔ انہوں نے ابن خلکان کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے درمیان ہونے والے ایک مناظرے میں امام محمدؒ نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ امام مالکؒ ان کے استاد امام ابوحنیفہؒ کے مقابلے میں قرآن، حدیث، اور اقوال صحابہؓ کا زیادہ علم رکھتے تھے۔ رہ گیا قیاس تو وہ انہی چیزوں کی بنا پر ہوتا ہے۔ (ص ۲۳)

مولانا رحیم آبادیؒ نے تو تاریخ ابن خلکان کے حوالے سے امام مالکؒ کی اس پشیمانی کا ذکر بھی کیا ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنی وفات کے وقت کیا تھا کہ انہوں نے اپنی رائے سے فتاوے کیوں دیے۔ اس ذیل میں انھوں نے مؤطا کے مختلف شارحین کے اقوال امام مالکؒ کی عظمت حدیث اور مؤطا کی مقبولیت کے سلسلے میں پیش کیے ہیں۔ (ص ۲۴-۲۵)

امام شافعیؒ کے قلیل الروایۃ ہونے کا رد کرتے ہوئے محمدی صاحب نے نعمانی صاحب کے حافظ ابن حجرؒ کے رسالہ ”توالی الدرایسیس“ کی پیش کردہ سند کی تغلیط کرتے ہوئے اصل عبارت پیش کی ہے، جس کا آخری جملہ یہ ہے: ”اگر (امام شافعیؒ) حدیث کی جانب بالکل متوجہ ہوتے تو امت محمدیؐ کو کسی دوسرے محدث کی ضرورت نہ ہوتی۔“ (ص ۲۶) اس کے بعد امام شافعیؒ کی وسعتِ علم کے سلسلے میں تاریخ ابن خلکان سے یہ قول نقل کیا ہے:

حسن البیان -- مطالعہ و تجزیہ

”امام شافعیؒ میں قرآن و حدیث، اقوال و آثار صحابہؓ اور اختلاف اقوال علماء کے علاوہ کلام العرب و لغت دانی اور عربیت و شاعری، یہ سب علوم مجتمع تھے۔ ایسی جامعیتِ علوم کسی (اور) شخص میں نہیں پائی گئی۔“

صاحب ’سیرۃ النعمان‘ لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجرؒ نے امام شافعیؒ کی قلتِ شیوخ کا جو سبب بیان کیا ہے، امام ابو حنیفہؒ کی قلتِ روایت کا بھی وہی سبب ہے۔ صاحب ’حسن البیان‘ معارضہ کرتے ہیں کہ ”امام شافعیؒ نے اکثر احادیث کے بعد بہ سبب اشتغالِ فقہ اکثر سند کی طرف توجہ نہیں کی، جیسا کہ حافظ ابن حجرؒ کی عبارت کا منشا ہے اور امام ابو حنیفہؒ نے اول ہی سے اشتغالِ بالفقہ رکھا اور سرے سے حدیث کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوئے۔“ (ص ۲۷)

”میں کہتا ہوں کہ کوئی معتمد روایت اس معنی کی نہیں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فلاں فلاں محدث کی شاگردی کی اور ان کی صحبت میں رہے اور حدیثیں حفظ کیں۔ یوں بعض بعض محدثوں سے اتفاقاً ملاقات ہوئی اور ان سے کوئی حدیث سن لینا اور روایت کرنا یہ اور امر ہے۔“ (ص ۳۰)

نعمانی صاحب نے امام صاحب کے اساتذہ حدیث میں حضرت جعفر صادقؒ کا نام بھی لیا ہے۔ رحیم آبادی صاحب لکھتے ہیں:

”امام جعفر صادقؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے پوچھا کہ تم اس مجرم کے حق میں کیا کہتے ہو جو ہرن کے چار دانت توڑ دے۔ امام ابو حنیفہؒ نے کہا: اے اولادِ رسولؐ مجھے نہیں معلوم۔ امام جعفر صادقؒ نے فرمایا: تم عقل خوب دوڑاتے ہو اور اتنا نہیں جانتے کہ ہرن کے چار دانت نہیں ہوتے۔“

’حیاء الحیوان‘ سے جناب معترض نے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب حضرت جعفر صادقؒ کو معلوم ہوا کہ ابو حنیفہؒ یہی ہیں تو انہوں نے تذکیراً کہا کہ ”قیاس مت کر، کیوں کہ پہلا قیاس کرنے والا بلیس تھا۔“

ان دونوں روایتوں سے امام صاحب کی جعفر صادقؒ کی شاگردی کی حقیقت پر

خوب روشنی پڑتی ہے۔

امام مالکؒ اور امام صاحب کے علم اور طریق اجتہاد پر گفتگو کرتے ہوئے محمدی صاحب نے ”حجة اللہ البالغۃ“ سے شاہ ولی اللہؒ کی یہ رائے نقل کی ہے:

”امام مالکؒ علماء مدینہ کی حدیثیں خوب یاد رکھتے تھے اور ان کی سند نہایت قوی تھی اور حضرت عمرؓ کے فیصلے اور عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان کے شاگردوں کے اقوال خوب جانتے تھے اور انہی کے ہم سروسے روایت اور فتوے کا علم قائم ہوا۔“ اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ کا حال لکھا ہے: ”امام ابوحنیفہؒ نے ابراہیم نخعیؒ اور ان کے اقران کا مذہب لازم پکڑا تھا۔ نہیں مانتے تھے اس سے مگر بہت کم اور ابراہیم نخعیؒ کے قواعد پر مسائل نکالنے میں بڑی شان رکھتے تھے اور اس کے طریق میں بڑے باریک بین تھے اور پوری توجہ ان کی فروغ پر تھی۔۔۔۔۔“ (ص ۳۲)

نعمانی صاحب نے محدثین اور فقہاء کے طریق استنباط پر جو تقریر کی تھی، اس کا رد کرتے ہوئے محمدی صاحب نے طریقہ اہل حدیث اور طریقہ فقہاء کے درمیان فرق واضح کرنے کے لیے شاہ ولی اللہؒ کی مصنفی شرح مؤطا کی درج ذیل عبارت پیش کی ہے:

”یہ معلوم و متعین ہے کہ سلف مسائل و فتاویٰ کا دو طریقوں سے استنباط و استخراج کرتے تھے: ایک یہ کہ وہ قرآن کریم، احادیث رسول اور آثار صحابہ کو جمع کرتے تھے اور ان سے مسائل مستنبط کرتے تھے۔ یہ اصلاً محدثین کا طریقہ تھا۔ دوسرے یہ کہ شریعت کے اصول و قواعد، جن کو ایمہ کرام نے تہذیب و تنقیح کے تحت اختیار اور جمع کیا ہے، ان پر پیش آمدہ مسائل کی تدوین فرمائی۔ یہ اصلاً فقہاء کا طریقہ رہا ہے۔ اس سے اس بات کی طرف اشارہ ملتا ہے کہ حماد ابراہیم کے مسلک کو بہتر طور پر جانتے تھے اور انھوں نے اپنے فتاویٰ کی تنقیح و تہذیب میں انہی کے اصول و قواعد کو ملحوظ رکھا تھا۔“

اس کی مزید شرح شاہ صاحبؒ نے حجة اللہ البالغۃ میں کی ہے۔ ذکر محدثین کے بعد لکھتے ہیں:

”امام مالکؒ اور سفیان ثوریؒ وغیرہ کے زمانے میں محدثین کے مقابلہ میں ایک

قوم تھی جو کثرت سوال کو برا نہیں جانتی تھی اور بے دھڑک فتویٰ دے دیتی تھی اور کہتی تھی کہ فقہ ہی پر دین کی بنیاد ہے، ضرور چاہیے اس کی اشاعت کرنی اور روایت حدیث سے بھاگتے تھے۔“ (ص ۳۴)

ابن مبارک نے فرمایا: ”دین اہل حدیث کے پاس ہے، باتیں بنانا معتزلہ کے پاس، جھوٹ و افوض کی عادت ہے اور اہل الرائے حیلوں کے عادی ہیں۔“ (ص ۴۴) مولانا اسماعیل سلفیؒ فرماتے ہیں ”ہمارے ہاں تفقہ، درایت اور قیاس کا اپنی جگہ پر پورا احترام ہے، لیکن سنن صحیحہ کو، گو وہ آحاد ہی کیوں نہ ہوں، ہم ان حیلوں اور الفاظ کی ہیرا پھیری سے رد کرنا پسند نہیں کرتے۔“ (ص ۲۶۳)

علامہ ابن خلدونؒ نے امام ابو حنیفہؒ کو قلیل الحدیث کہا تھا۔ نعمانی صاحب نے اس کی بنیاد پر فرمایا ہے کہ ”بعض کوتاہ بینوں نے امام صاحبؒ کے ناواقفیت حدیث پر ابن خلدون کے ضمنی قول سے استدلال کیا ہے۔“ اس پر جرح کرتے ہوئے محمدی صاحب نے ابن خلدون کی پوری عبارت نقل کی ہے:

”امام ابو حنیفہؒ کی روایت اس وجہ سے کم ہے کہ انھوں نے حدیث کی روایت کرنے اور یاد کرنے کی شروط سخت رکھے تھے، اور وہ حدیث صحیح کی روایت کو ضعیف کہہ دیتے اگر قیاس ان کے معارض ہوتا۔ اس وجہ سے ان کی روایت حدیث کم ہوئی، نہ یہ کہ انھوں نے قصداً حدیث کی روایت چھوڑ دی۔ ان کی شان سے یہ بعید ہے۔“ (ص ۳۸)

محمدی صاحب اس پر بھی معارضہ کرتے ہیں کہ: ”میں کہتا ہوں کہ واقع کے محض خلاف ہے یہ امر کہ امام ابو حنیفہؒ نے باعث احتیاط اور شدت شروط کے روایت کم کی۔ امام ابو حنیفہؒ کی روایت ضعیف سے موجود ہے۔ اس کا اعتراف مولانا عبدالحی لکھنویؒ نے ’التعلیق المجد‘ میں یوں کیا ہے: ”وفیہا أنه روی کثیراً من الضعفاء وهذا أمر مشترك بین العلماء“، یعنی ایں گناہست کہ در شہر شامیز کنند۔“ (ص ۳۹)

نعمانی صاحب نے قلت روایت کے تقابل میں حضرات ابو بکرؓ و عمرؓ کے نام لیے ہیں اور بتایا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ سے صرف سترہ (۱۷) حدیثیں اور حضرت عمرؓ سے

پچاس (۵۰) حدیثیں مروی ہیں۔ محمدی صاحب نے مقدمہ فتح الباری کے حوالے سے بتایا ہے کہ صرف بخاری میں حضرت عمرؓ سے ساٹھ (۶۰) حدیثیں مروی ہیں۔ حافظ سیوطیؒ نے تاریخ الخلفاء کے حوالے سے بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ سے پانچ سو انتالیس (۵۳۹) حدیثیں مروی ہیں۔ (ص ۴۲)

امام بخاریؒ کے ملکہ فقہت و اجتہاد کے بارے میں محمدی صاحب نے طویل گفتگو فرمائی ہے اور فتح الباری، فوائد مہیہ، ابن خلدون وغیرہ کے طویل اقتباسات پیش کیے ہیں۔ آخر میں اپنی رائے دی ہے کہ: ”حدیث کی روایت میں بخاری و مسلم کی شرطیں بہت سخت ہیں۔ اس کے باوجود ان کی ہزار ہا روایتیں صحیحین میں موجود ہیں۔ اس کے برخلاف امام صاحب کی قلت روایت باعث تشدد و شروط نہیں ہے۔“ (ص ۴۸)

نعمانی صاحب نے امام صاحبؒ کے قبول روایت کی پہلی شرط یہ لکھی ہے کہ صرف وہ حدیث حجت ہے جس کو راوی نے اپنے کان سے سنا ہو۔ محمدی صاحب اس پر معارضہ کرتے ہیں کہ اکثر شیوخ کا حلقہ درس اتنا وسیع ہوتا تھا کہ متعدد مستمعی جا بجا لگائے جاتے تھے۔ اس صورت میں ہر شخص کے لیے شیخ کے الفاظ کا اپنے کانوں سے سنا ممکن نہ تھا۔ امام صاحب کے قلیل الروایۃ ہونے کا سبب کہیں یہ تو نہیں کہ وہ شیخ کے حلقہ درس میں پائین مجلس جگہ پاتے تھے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ان کی مقبولیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اس باب میں انھوں نے حافظ ابن صلاح (مقدمہ) اور حافظ سخاوی (فتح المغیث) کو سند میں پیش کیا ہے۔ (ص ۴۹)

نعمانی صاحب نے حسن بصریؒ پر الزام لگایا ہے کہ وہ حدیثنا أبو ہریرۃ کہا کرتے تھے، حالانکہ وہ ابو ہریرہؓ سے کبھی نہیں ملے تھے۔ محمدی صاحب نے فتح المغیث کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہ بات صحیح نہیں، بلکہ بعد کے راویوں کی خطا ہے۔ (ص ۵۰)

نعمانی صاحب نے قبولیت روایت کی دوسری شرط یہ بتائی ہے کہ تحریر کے بعد بھی حدیث کے الفاظ و مطالب محفوظ رہنے چاہئیں۔ محمدی صاحب کہتے ہیں کہ ”بنا بر اصول حدیث کے بھی زبانی یاد سے بہ دست خود لکھا ہوا اور پڑھا ہوا زیادہ قابل اعتبار

حسن البیان۔۔ مطالعہ و تجزیہ

ہے۔ اگر صرف لکھا ہوا اس کے پاس نکلا اور اس کو بالکل یاد نہیں ہے تو ایسی صورت میں مذہب منصور محدثین کا بھی عدم جواز روایت ہے؛ کذا فی فتح المغیث و المقدمۃ للحافظ ابن الصلاح۔ تو پھر اس شرط کی تخصیص امام صاحب کے لیے کیوں؟ (ص ۵۲) تیسری شرط امام صاحب کے قبول روایت کی، جو نعمانی صاحب نے لکھی ہے، یہ مسئلہ ہے کہ روایت بالمعنی جائز ہے یا نہیں؟ سیرۃ النعمان کی پہلی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ روایت بالمعنی کو جائز نہیں سمجھتے تھے، پھر لکھا ہے کہ امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کرنے میں یہ شرط رکھی ہے کہ وہ فقیہ ہوں۔ مگر بعد میں پھر لکھتے ہیں کہ امام صاحب نے ان احادیث کو بھی قبول کیا ہے جن کے رواۃ ثقہ ہوں اور فقیہ نہ ہوں۔ محمدی صاحب لکھتے ہیں کہ تحریر کا یہ اضطراب خود ظاہر کرتا ہے کہ امام صاحب کی قلت روایت کے لیے یہ کوئی سبب نہیں ہے۔

نعمانی صاحب کے یہ قول امام صاحبؒ نے روایت بالمعنی میں فقہ راوی کی جو شرط لگائی ہے اور اس کی جو تشریح فرمائی ہے وہ خود خلاف عقل ہے، کیوں کہ کسی فعل کی روایت الفاظ اور معنی سے متعلق ہے، اسی لیے فقہ راوی کی جو تعریف محدثین نے فرمائی ہے (یعنی عربیت کا علم اور ضابط ہونا) وہی درست ہے۔ چنانچہ سیرۃ النعمان میں امام اوزاعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے رفع الیدین کے مسئلہ میں مناظرہ کی جو بحث ہے وہ مہمل اور بے معنی ہے۔ امام رازیؒ نے تو اس واقعہ ہی کو غلط قرار دیا ہے۔ اسی طرح قلیب بدر پر رسول اللہ ﷺ نے جو خطبہ دیا تھا اور امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ سے اس کی جو روایت کی ہے اسے درست ٹھہرایا ہے۔

علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے اصول درایت قائم کیے۔ اس سے اختلاف کرتے ہوئے صاحب حسن البیان نے ذکر کیا ہے کہ اصول فقہ کے بانی امام ابو حنیفہؒ نہیں، بلکہ امام شافعیؒ تھے، جن کی کتاب ’الام‘ مطبوعہ موجود ہے۔ اس دعویٰ کے اثبات میں انھوں نے حجة الله البالغة کا حوالہ دیا ہے۔

صاحب سیرۃ النعمان نے اس کے بعد اخبار آحاد پر بحث کی ہے۔ اس ضمن میں

محمدی صاحب نے مذہب حنفیہ میں حدیث پر تقدیم قیاس کی مثالیں دی ہیں اور اقسام حدیث سے نعمانی صاحب کی ناواقفیت ثابت کی ہے۔ اس ذیل میں انہوں نے مقدمہ ابن صلاح، فتح المغیث، مقدمہ ابن خلدون، تاریخ ابن خلکان، حجة اللہ البالغۃ اور شیخ عبدالحق دہلوی کے صاحبزادہ مولوی نورالحق کی تصنیف ’تیسیر الباری‘ کے حوالے دیے ہیں۔ (ص، ۸۳ تا ۹۱)

خبر واحد سے زیادہ علی الکتاب کے مسئلہ میں نعمانی صاحب نے امام شافعیؒ اور امام محمدؒ کے درمیان ایک مناظرہ کا ذکر فرمایا ہے۔ محمدی صاحب نے شاہ ولی اللہ کی ’حجة‘ اور ’الانصاف‘، علامہ ابن خلکان کی تاریخ، سبکی کی ’طبقات الکبریٰ‘ اور بیہقی کی ’مناقب شافعی‘ سے اس مناظرہ کی تفصیل فراہم کی ہے۔ چونکہ محمدی صاحب نے خبر واحد سے زیادہ علی الکتاب کو مسائل حنفیہ سے مثالیں دے کر اپنی گفتگو کو منوکد کیا ہے، اس لیے طوالت کو گوارا کرتے ہوئے اس مناظرہ کی پوری روداد قارئین کے سامنے رکھنی مناسب معلوم ہوتی ہے:

”مضمون قصہ یوں ہے کہ امام محمدؒ علمائے مدینہ پر طعن کر رہے تھے کہ وہ جس مقدمہ میں دو گواہ نہیں ہوتے اس میں ایک گواہ اور قسم پر فیصلہ کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ نے اولاً اس جملے (مدینہ والے) پر بیزاری ظاہر کی کہ تم اس شہر کو برا کہتے ہو یا اس شہر والوں کو؟ اگر شہر کو برا کہتے ہو تو یہ شہر مہبط جبریلؑ و وحی ہے اور اگر شہر والوں کو کہتے ہو تو شہر والے مہاجرین و انصار ہیں۔ امام محمدؒ کو اس پر عبرت ہوئی۔ اس کے بعد امام شافعیؒ نے وجہ اعتراض پوچھی۔ امام محمدؒ نے کہا کہ علمائے مدینہ ایک گواہ اور قسم پر بنا بر خبر واحد کے فیصلہ جائز رکھتے ہیں، حالاں کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے دو گواہوں کا ذکر کیا ہے۔ امام شافعیؒ بولے کہ کیا آپ کے نزدیک خبر واحد سے قرآن پر زیادتی نہیں ہو سکتی؟ امام محمدؒ نے کہا: ہاں۔ امام شافعیؒ بولے کہ قرآن میں وارثوں کے حق میں وصیت کا حکم ہے، پھر آپ خبر واحد (لا وصیۃ لوارث) کی بنا پر وارث کے لیے وصیت کیوں ناجائز قرار دیتے ہیں۔“ اس پر امام محمدؒ لا جواب ہو گئے۔

صاحب سیرۃ النعمان نے اس مضمون کو حجة اللہ البالغۃ سے نقل کر کے یہ

اعتراض کیا ہے کہ حنفیوں کے نزدیک وارثوں کے حق میں وصیت (کتاب میں لفظ 'وراثت' ہے۔ غالباً کتابت کی غلطی ہوگی) کا حکم کسی حدیث سے نہیں، بلکہ خود قرآن مجید کی اس آیت سے منسوخ ہوا ہے جس میں توریت کے احکام ہیں۔ صاحب سیرۃ النعمان کا یہ اعتراض ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ نسخ کے لیے نسخ و منسوخ کے درمیان معارضہ ہونا شرط ہے، کیوں کہ لغت میں نسخ کے معنی ابطال اور ازالہ کے ہیں اور آیت وصیت اور آیت میراث کے درمیان کوئی معارضہ نہیں، بلکہ آیت میراث وصیت کی مؤکد ہے، کیوں کہ اس میں من بعد وصیۃ موجود ہے۔

محمدی صاحب نے فقہائے حنفیہ کے عموماً بے سند روایت کرنے کی مثالیں بھی دی ہیں۔ مثلاً کتاب الآثار میں مسیح اذین کے ضمن میں ہے: "قال محمد: قال أبو حنیفہ بلغنا ان رسول اللہ ﷺ۔۔۔۔۔"، دوسری روایت اسی کتاب میں یوں ہے: أخبرنا أبو حنیفہ قال حدثنا الهیثم بن أبی الہیثم یرفعہ الی النبی ﷺ۔۔۔۔۔ اس کے برخلاف صحیحین میں ایک ایک حدیث کی متعدد اسناد ہیں۔ (ص ۱۰۲) اس کے بعد محمدی صاحب نے حدیث وفقہ کے مفہوم کی وضاحت میں نعمانی صاحب کے افکار کا محاسبہ کیا ہے اور کہا ہے کہ یہی سبب ہے کہ امام ابوحنیفہؒ حدیث ضعیف کے مقابلہ میں اپنی رائے کو کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ یہاں بھی انہوں نے حافظ سخاویؒ کی 'فتح المغیث' اور مولانا عبدالحی لکھنویؒ کی 'شرح مختصر' سے اپنی بات کا اثبات کیا ہے۔

محمدی صاحب کا خیال ہے کہ "محدث کو بر بنائے اسناد و دلائل کے حدیث کی صحت اور واجب العمل ہونے پر جزم ہوتا ہے اور فقہاء کو اپنے مستنبط کردہ مسائل کی صحت پر ایسا جزم نہیں ہوتا کہ وہ اس کو واجب العمل کہیں"۔ (ص ۱۰۸)

"بخاری کے ہر طبقہ میں دو راوی ہیں، الا ماشاء اللہ، جو کہ شہادت کا قرآنی نصاب ہے"۔ (ص ۱۰۹)

مسائل شرعیہ جیسے ولادت، رویت ہلال رمضان میں ایک عادل شخص کی گواہی پر حکم کرنا متفق علیہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے نام مبارک کو ایک ہی شخص لے کر جاتا

تھا۔ قیصر روم کے پاس حضرت دحیہؓ کلبیؓ نامہ مبارک لے کر گئے تھے۔ (ص ۱۰۹)
 تصحیح و تضعیف روایات میں اختلاف کی وجہ سے ہی اقسام حدیث کی مختلف اصطلاحات، جیسے صحیح، حسن، ضعیف وغیرہ وضع ہوئی ہیں۔ (ص ۱۱۱)

محمدی صاحب نے حدیث مرفوع کے بحث کا ایک اہم عنوان قائم کیا ہے۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”مؤلف سیرۃ النعمان حدیث کو بے اعتبار ثابت کرنے کی ہر کوشش کرتے ہیں۔ یہ حنفیت اور نہ چریت کے اشتراک کا ثمر ہے“ (ص ۱۱۷)
 ”مؤلف کے احتمالات کی زد تو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے افضل الصحابہ ہونے پر بھی پڑتی ہے“۔ (ص ۱۱۸)

صاحب سیرۃ النعمان کا قول ہے کہ ”امام بخاریؒ کے اصول کے موافق امام مسلم کی وہ تمام معنعن روایتیں، جن میں لقاء ثابت نہیں، مقطوع ہیں“۔ محمدی صاحب کہتے ہیں کہ ”کسی اصولی مسئلہ میں اختلاف ہونے کو یہ لازم نہیں کہ صحیح مسلم میں ایسی معنعن روایتیں موجود ہیں جن میں لقاء ثابت نہ ہو۔ امام مسلمؒ نہ ساری حدیثیں، جو ان کے نزدیک صحیح تھیں، اپنی کتاب میں لائے اور نہ کل احادیث صحاح کا استیعاب ان کو مقصود تھا، بلکہ اپنی صحیح میں وہ وہی حدیثیں لائے ہیں جن کی صحت پر اتفاق تھا“ (ص ۱۱۹)

محمدی صاحب نے اس پر یہ الزام عائد کیا کہ ”امام ابو حنیفہؒ نے تو ایسی معنعن روایتیں قبول کی ہیں جن میں راوی اور مروی عنہ کا لقاء تو درکنار، ایک زمانہ میں ہونا بھی نہیں پایا جاتا“۔ نمونے کے طور پر انھوں نے کتاب الآثار سے تین حدیثیں پیش کی ہیں: پہلی حدیث تین رکعات وتر کی ہے۔ (ص ۱۲۰) اور تیسری روایت کے راوی ابراہیم ہیں، جنھیں تقریب التہذیب نے چھٹے درجے میں رکھا ہے۔

نعمانی صاحب نے فن رجال کی اس طور پر قرح کی ہے کہ مسلمانوں کا یہ عظیم الشان کارنامہ اپنی شناخت کھودیتا ہے اور پورا دین مشتبہ ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ”رجال کی تنقید و توثیق ایسا ظنی مسئلہ ہے جس کا قطعی فیصلہ نہایت مشکل اور قلیل الوجود ہے“۔ محمدی صاحب کا کہنا ہے کہ رواۃ کے اختلاف اور امام صاحبؒ اور ان کے شاگردوں کے اختلافات

میں یکسانیت ہے، پھر حدیث کے ساتھ ہی فقہ بھی مجروح ثابت ہوا۔ (ص ۱۲۶)

نعمانی صاحب نے لکھا ہے کہ ”اخبارِ آحاد کی بحث کو ہم نے قصداً اس لیے طول دیا کہ محدثین زیادہ تر اسی مسئلہ کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ پر رد و قرح کرتے ہیں۔۔۔۔ امام صاحبؒ نے معتزلہ کی طرح سرے سے انکار کیا، نہ ظاہر بینوں کی طرح خوش اعتقادی سے اس کی قطعیت تسلیم کی۔“ اس پر محمدی صاحب لکھتے ہیں: ”میں کہتا ہوں کہ یہ بات دروغ بے فروغ ہے کہ محدثین اخبارِ آحاد کو قطعی کہتے ہیں اور اس کی مخالفت کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ پر رد و قرح کرتے ہیں۔ یہ سراپا کذب ہے۔ محدثین نے ہر گز ہر گز اخبارِ آحاد کو قطعی نہیں کہا۔ رہا واجب العمل ہونا تو اس میں بھی اختلاف نہیں ہے۔ خبرِ آحاد کے واجب العمل ہونے کے امام ابو حنیفہؒ بھی قائل ہیں۔ تمام کتبِ اصول حنفیہ میں اخبارِ آحاد کو واجب العمل لکھا گیا ہے۔“ اس کے ثبوت میں انھوں نے حسامی کی ایک طویل عبارت نقل کی ہے۔ (ص ۱۲۸، ۱۲۹)

فاطمہ بنت قیسؓ کی روایت میں محمدی صاحب نے صحیح مسلم کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول ہے: ”لا أترك كتاب الله بقول امرأة لا أدرى حفظت أم نسيت“ یعنی میں قرآن کو نہیں چھوڑ سکتا ایسی عورت کے قول سے جس کو نہیں جانتا کہ یاد رہا ہے یا بھول گئی۔ پھر فرمایا ہے کہ صاحب سیرۃ العمان نے اس روایت کے بیان میں غلطی سے یا کسی اور وجہ سے نسیت کی جگہ کذبت کے الفاظ لکھ دیے، جس کی وجہ سے حدیث کا عندیہ غلط ہو گیا ہے۔ (ص ۱۳۰)

فرض اور واجب کی تقسیم کے عنوان کے تحت محمدی صاحب لکھتے ہیں کہ ”حنفیہ خود ایسے امور کو فرض کہتے ہیں جن میں کوئی دلیل قطعی نہیں۔ مثلاً وہ قہقہہ مصلی سے وضو فرض کہتے ہیں، حالاں کہ اس میں قطعی تو درکنار، کوئی دلیل ظنی بھی نہیں۔ خون اگر کپڑے میں لگ جائے تو اسے دھونا فرض کہتے ہیں۔ ایسے ہی خون نکلنے سے وضو فرض کہتے ہیں، حالاں کہ اس میں کوئی دلیل قطعی تو درکنار، دلیل ظنی بھی نہیں ہے۔ اور بہت سے ایسے امور جو ثابت بہ دلیل قطعی ہیں، ان کو حنفیہ فرض نہیں کہتے۔ مثلاً نعوذ یعنی أعوذ بالله من الشيطان الرجيم پڑھنا۔ امام ابو حنیفہؒ اسے فرض کیا، واجب بھی نہیں کہتے، حالاں کہ یہ قرآن کا مسئلہ ہے۔

آیت کریمہ اذا قرأت القرآن فاستعذ بالله من الشیطان الرجیم قرآن میں موجود ہے۔ صاحب سیرۃ العثمان اس کو بھی ظنی کہہ دیں۔ نمازیں سبحان ربی العظیم اور سبحان ربی الاعلیٰ کہنا وہ فرض کیا، واجب بھی نہیں کہتے، حالانکہ قرآن میں فسبح باسم ربک العظیم اور سبح اسم ربک الاعلیٰ آیتیں موجود ہیں۔ صاحب سیرۃ العثمان فرمائیں: کیا یہ آیتیں قطعی نہیں ہیں؟ اس موقع پر شاید صاحب سیرۃ انعمان یہ کہیں کہ ان سب آیتوں میں نماز کی قید نہیں ہے تو جواب اس کا اولاً یہ ہے کہ پھر ان آیتوں کا مورد بتائیے جہاں امام ابوحنیفہؒ نے فرض کیا ہو، دوسرے حنفیہ تکبیر تحریمہ کی فرضیت کی دلیل وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ کہتے ہیں۔ اس میں نماز کی قید کہاں ہے؟ (ص ۱۳۱، ۱۳۲)

صاحب 'حسن البیان' نے اس موقع پر قرآن سے اور بھی کئی مثالیں دی ہیں، جن میں نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کے وجوب کی فرضیت کی بنا بھی شامل ہے، لیکن اسے طوالت کے سبب نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے حدیث کذبات ابراہیمؑ پر اعتراض کا جواب بھی دیا ہے، لیکن چوں کہ یہ مضمون اب پامال ہو چکا ہے، اس لیے اس سے بھی صرف نظر کیا جاتا ہے۔

نعمانی صاحب نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ معوذتین کے جزء قرآن ہونے سے انکار کرتے تھے۔ اس سے معوذتین کا غیر متواتر ہونا لازم آتا ہے۔ اس پر صاحب 'حسن البیان' نے لکھا ہے کہ متواتر کی تعریف یہ ہے کہ اتنے لوگ اس کے راوی ہوں کہ ان کا 'تواطؤ علی الکذب' خلاف عقل ہو، ایک آدھ آدمی کا اختلاف اس کے منافی نہیں ہے۔

'سیرۃ العثمان' میں فقہ کا جزوالگ ہے۔ مؤلف 'حسن البیان' نے بھی اسی ترتیب سے اپنی تعقیبات درج کی ہیں۔ فقہ الصحابہ اور فقہ اہل الرائے کا فرق ظاہر کرتے ہوئے محمدی صاحب حجۃ اللہ البالغۃ سے شاہ ولی اللہؒ کی یہ رائے نقل کرتے ہیں:

”فقہاء نے صورت مسئلہ کی ایک یہ (شکل) پیدا کر لی کہ کوئی شخص وضو اس طرح کرے کہ پہلے پیر دھوئے، پیچھے منہ۔ اس کو فرض کر کے اس پر بحث شروع کر دی۔ یہ طریقہ صحابہؓ کا نہ تھا۔ مثلاً یہ صورت فرض کر لی کہ کتے اور بکری سے بچہ پیدا ہو تو وہ حلال

ہے یا حرام۔ فقہ کی کتابوں میں یہ اور ایسے مسائل بہت ہیں۔ صحابہ اور تابعین کی یہ سیرت نہ تھی۔ پھر اس فقہ کو صحابہؓ کی جگہ پر قیاس کرنا سیر کو شیر پر قیاس کرنا ہے۔ (ص ۱۳۹)

صاحب سیرۃ النعمان اس موقع پر لکھتے ہیں: ”صحابہؓ میں جن لوگوں نے استنباط و اجتہاد سے کام لیا اور مجتہد اور فقیہ کہلائے ان میں سے چار بزرگ نہایت ممتاز تھے: عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور عبداللہ بن عباسؓ۔ محمدی صاحب کہتے ہیں کہ ”اولاً تو یہ بات غلط ہے کہ صحابہ کرامؓ میں یہی چار بزرگ فقہ و استنباط مسائل میں ممتاز تھے، فقہ و مسائل میں جو صحابہؓ ممتاز تھے امام ابن حزمؒ نے ان کے یہ نام دے دیے ہیں: عمرؓ، علیؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن عباسؓ، زید بن ثابتؓ، عائشہؓ۔ دوسرے یہ بات غلط ہے کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ زیادہ تر کوفہ میں رہے۔ حضرت علیؓ ۳۶ھ میں مدینہ سے نکلے اور ۳۸ھ تک جنگ جمل و جنگ صفین و جنگ نہروان میں مشغول رہے۔ بعد اس کے اقامت آپ کی کوفہ میں صرف دو برس ہے۔۔۔ اور اصحابہؓ میں ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ بھی ابتدا سے مدینہ ہی میں رہے۔ حضرت عمرؓ نے عمارؓ کو کوفہ کا حاکم بنا کر بھیجا۔ عبداللہ بن مسعودؓ کو کوفہ کا حاکم بنایا، پھر ان کو موقوف کر کے مدینہ طلب کر لیا۔“ (ص ۱۴۰، ۱۴۱)

اس باب میں کہ مدینہ اور کوفہ کیا دارالعلم ہونے میں برابر تھے؟ محمدی صاحب مصنفیؒ سے شاہ ولی اللہؒ کی یہ عبارت نقل کرتے ہیں: ”مدینہ مشرفہ در زمان او (امام مالکؒ) پیشتر از زمان متأخر بے شبہ مرجع فضلاء و محط رجال علماء بودہ است و زمانے بعد زمانے مفتیان عظیم ایشاں کہ ہمہ عالم را قبلہ توجہ ایشاں بود پیدا می شدند۔“ (ص ۱۴۲) انھوں نے کوفہ کی مجلس فقہ کی تشکیل پر بھی اشکالات و احتمالات وارد کیے ہیں، جن میں بعض ارکان کی توقیفی مناسبت پر گفتگو کی گئی ہے۔ (ص ۱۴۳)

نعمانی صاحب نے ترجیح حنفیت کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ”اس میں وسعت اور آزادی پائی جاتی ہے، جو اور ائمہ کے مسائل میں نہیں پائی جاتی۔“ محمدی صاحب نے تفہیمات الہیہ سے شاہ ولی اللہؒ کا قول نقل فرمایا ہے: ”سلاطین و عوام حنفی مذہب ہوئے اور دوسرے ائمہ کے مذہب میں محدثین و مفسرین و صوفیہ کرام ہوئے۔“ (ص ۱۴۵)

انھوں نے سلاطین کے مذہبِ حنفیت کی طرف میلان کا سبب ہارون رشید کے دربار میں قاضی ابویوسفؒ کے تقرر کو بتایا ہے اور مقبولیت کے اسباب میں سلاطین کے عورتوں کی طرف رغبت کے تین واقعات درج کیے ہیں، جن کا دہرا نامناسب نہیں ہے۔ (ص ۱۴۶، ۱۴۷)

محمدی صاحب نے فقہ حنفی میں جوازِ نکاح کے جو مسائل بیان کیے ہیں (جن کا نقل کرنا مناسب اور ضروری نہیں) ان سے اسلام میں عورتوں کی بے بسی اور ان پر مردوں کی بے جا بالادستی ثابت ہوتی ہے۔ (ص ۱۵۰)

مغرب میں مالکیت کے شیوع کی وجہ کیا بدویت تھی؟ نعمانی صاحب نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں علامہ ابن خلدون سے استشہاد کیا ہے۔ محمدی صاحب نے ابن خلدون کی پوری عبارت نقل کر دی ہے:

”ان لوگوں نے سوائے امام مالکؒ کے اور کسی کی تقلید نہیں کی، مگر کم۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اکثر آمد و شد ان کی حجاز کی طرف تھی اور وہیں تک ان کا آنا جانا تھا اور اس زمانہ میں مدینہ دارالعلم تھا۔ وہیں سے علم عراق پہنچا تھا۔ اہل مغرب، اندلس کی راہ میں عراق نہیں پڑتا تھا، لہذا ان لوگوں نے علمائے مدینہ ہی سے اخذ کیا۔ یہ بات بھی تھی کہ مغرب اور اندلس والوں میں بدویت غالب تھی اور ان کو عروج عراق والوں کا سامنا تھا۔ اس بدویت کی مناسبت کی وجہ سے ان کو حرین کی طرف میلان زیادہ تھا۔“

علامہ ابن خلدون کی اس پوری تقریر سے کیا اہل مغرب میں فقہ مالکی کی ترویج کا سبب واقعی صرف ان کی بدویت ثابت ہوتی ہے؟ (ص ۱۵۴، ۱۵۵)

نعمانی صاحب کے اس دعوے کے رد میں کہ ”علم فقہ کے متعلق سب سے بڑا کام، جو امام صاحبؒ نے کیا، وہ تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں امتیاز قائم کرنا تھا“ محمدی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ یہ کام تو اصلاً حضرت عمرؓ نے کیا تھا۔ غسل جمعہ کے تعلق سے نعمانی صاحب نے جو گفتگو فرمائی ہے اس سے تو حضرت عمرؓ پر حضرت امام ابوحنیفہؒ کی برتری ثابت ہوتی ہے۔ (ص ۱۵۶، ۱۵۷)

نعمانی صاحب نے اس کے بعد ان چند مسائل پر تقریر فرمائی ہے جو احناف اور

اہل حدیث کے مابین اختلافی ہیں۔ ان کا ذیل میں اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا جا رہا ہے:

(۱) خروج النساء فی العیدین کا مسئلہ امام صاحبؒ کے نزدیک غیر تشریعی ہے۔

محمدی صاحب نے اس کے رد میں فرمایا ہے کہ ”اس باب میں حدیث میں تاکید ہے، رخصت نہیں ہے۔ یہی حکم نماز میں عورتوں کے نکلنے کا ہے۔ نماز عیدین کی تاکید تو یہاں

تک ہے کہ جس عورت کے پاس چادر نہ ہو اسے دوسری عورت اپنی چادر میں لے لے۔

حائضہ عورتیں نمازیں تو شریک نہ ہوں، لیکن خطبہ اور دعا میں شریک رہیں۔“

(ص ۱۵۸) احناف نے اس تاکید کو حضرت عائشہؓ کے اس قول سے ختم کر دیا ہے: لو

رأى رسول الله ﷺ ما أحدث النساء منعهن المساجد كما منعت نساء بنی

اسرائیل (اگر اللہ کے رسول ﷺ دیکھ لیتے کہ عورتوں میں کتنا بگاڑ آ گیا ہے تو انھیں

مسجد جانے سے منع کر دیتے، جس طرح بنی اسرائیل کی عورتوں کو منع کر دیا گیا تھا۔)

حالانکہ ان کا یہ قول ممانعت پر دلالت نہیں کرتا۔

(۲) فاذ طلاق اور تعیین جزیہ کے مسئلہ میں نعمانی صاحب نے جو فرمایا ہے کہ

امام صاحب کے نزدیک تشریعی نہیں ہیں تو اس میں اضطراب ہے، کیوں کہ امام صاحب

کی رائے ان معاملات میں واضح نہیں ہے۔ احکام شرعیہ کے بنی بر مصالحو ہونے کے

باب میں بھی نعمانی صاحب کی تشریحات امام صاحب کے کلی اصول سے میل نہیں

کھاتیں، لیکن یہ امر مسلم ہے کہ احکام شرعیہ میں اس قسم کی گفتگو مناسب نہیں ہے۔

(۳) قراءت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں عموم و خصوص کا معاملہ ہے۔ آخر نماز فجر

کی قراءت کے دوران حنفیہ سنت کی ادائیگی کا حکم کیوں دیتے ہیں؟ (ص ۱۶۳) قراءت

فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں نعمانی صاحب کے دلائل قیاس مع الفارق کے مثل ہیں، کیوں

کہ مسلک حنفی میں مقتدی کو قراءت کے علاوہ تمام ارکان بجالانے ہوتے ہیں۔ (ص ۱۶۵)

(۴) آمین بالجہر کے مسئلہ میں نعمانی صاحب نے تمام احادیث کا استقصاء نہیں کیا۔

مزید یہ کہ وہ امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب اور اس ذیل میں روایت کی گئی حدیثوں کے تعلق کو سمجھنے

سے قاصر رہے۔ محمدی صاحب نے اپنی گفتگو میں اس تعلق کو واضح کر دیا ہے۔ (ص ۱۶۷)

(۵) نبیذ تمر سے وضو میں نعمانی صاحب نے پانی نہ ہونے کی شرط کا ذکر نہیں کیا۔ دوسرے یہ کہ صرف تمر کی کیوں تخصیص ہے؟ دوسری اشیاء کی نبیذ کا یہی حکم کیوں نہیں ہے؟ اس بارے میں بنیادی سوال یہ ہے کہ نبیذ پانی کے مثل ہے یا نہیں؟ اگر پانی کے مثل ہے تو پانی نہ ملنے کی شرط لگانا بے معنی ہے اور اگر پانی کے مثل نہیں ہے تو اس سے وضو کے جواز کے لیے دلیل درکار ہے۔ (ص ۱۶۸)

(۶) قراءت فاتحہ خلف الامام کی فرضیت کے مسئلہ میں نعمانی صاحب نے کئی غلطیاں کی ہیں: اول تو یہ کہ واقعہ حضرت عمارؓ کا نہیں، بلکہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا ہے، دوسرے یہ کہ نعمانی صاحب نے امام بخاری پر اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث سے قراءت فاتحہ کا وجوب کیوں کر نکلا؟ محمدی صاحب کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ اس باب میں دو حدیثیں لائے ہیں۔ ان کے ترجمہ الباب کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی نماز میں قراءت واجب ہے، کیوں کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: صَلُّوا کَمَا رَأَيْتُمُوْنِیْ اَصْلَیْ۔ امام صاحب کے نزدیک بھی قراءت صرف ابتدائی دو رکعتوں میں فرض یا واجب ہے، بعد کی دو رکعتوں میں نہیں ہے۔ حضرت سعدؓ کی روایت میں ہے کہ پہلی دو رکعتیں ہم طویل کرتے ہیں، دوسری دو قصیر، تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ بعد کی دو رکعتوں میں صرف سورۃ فاتحہ پڑھتے ہیں۔ دوسری حدیث، جو اس باب میں امام بخاریؒ لائے ہیں، وہ قراءت فاتحہ کی دلیل خاص ہے۔ پہلی حدیث میں مطلق قراءت کی دلیل ہے اور دوسری حدیث میں اسی مطلق کی تنقید کی ہے، کیوں کہ مطلق کسی مقید ہی کے تحت پایا جائے گا۔ (ص ۱۷۱)

اسی اختلافی بحث پر دونوں کتابوں 'سیرۃ العمان' اور 'حسن البیان' کا اختتام ہوتا ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں مناظراتی ہیں۔ مقالہ نگار نے کوشش کی ہے کہ حتی الامکان اصل مصنفین کے الفاظ برقرار رکھے جائیں، نیز اس کی تحریر میں مناظرہ کا انداز نہ پیدا ہو۔ یہ بات معلوم ہے کہ احناف کے بہت سے مسائل صحیح احادیث کے خلاف ہیں، نیز بہت سے مسائل میں عمل کے لیے ان کے پاس کوئی حدیث نہیں ہے، اس لیے ان کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے، لیکن نزاع کی صورت نہیں پیدا ہونی چاہیے۔ خوشی کی بات ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان تصانیف کے بعد اپنا رخ بدل لیا اور